موم کا آدمی

نیلوفر کے ماموں افتخار احمد ٹی وی کے سینئر پروڈیوسر تھے اور کئی کامیاب پروگرام کر چکے تھے۔ اس لئے بڑی معتبر شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے کافی عمر ہو جانے کے باوجود شادی نہیں کی تھی اور سگی بہن کے ہاں پے اِنگ گیسٹ کے طور پر مقیم تھے۔

آج صبح ناشتے پر انہوں نے بتایا کہ وہ ایک فوک ڈرامے کے سلسلے میں سندھ کے گاؤں نوکوٹ جا رہے ہیں جس کے نزدیک تھر کا صحرا ہے اور انہیں دونوں مقامات پر اہم عکس بندی کرنا ہے۔

نیلوفر کو بھی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا مگر ماں کی طرف سے سختی سے ممانعت تھی۔ ماں کا خیال تھا کہ معزز گھرانے ایک اداکارہ کو بہو بناتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی معزز گھرانے میں اس کا رشتہ ہو۔ ماموں کے توسط سے نیلوفر کو بڑے بڑے اداکاروں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ نیلوفر کی خوبصورتی اور خود اعتمادی کی بنا پر انہوں نے اسے ڈراموں میں کام کرنے پر اُکسایا مگر ماں کی وجہ سے مجبور تھی البتہ باپ کو منا لینا آسان تھا۔ اب جب اس کے ماموں نے نوکوٹ جانے کے بارے میں بتایا تو اس کے دل میں ایک دم اشتیاق پیدا ہوا کہ وہ بھی افتخار احمد کے ہمراہ نوکوٹ جائے اور ڈرامے کی عکس بندی دیکھے۔ آخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"ماموں جان میں بھی چلوں.....! ویسے بھی کالج بند ہے میرا۔"

امی نے اسے تیز نظروں سے گھورا، "تم کیا کرو گی وہاں جا کر.....؟"

''امی.....! ایسے ہی..... پکنک منالیں گے۔'' اس نے ماں کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں..... ہاں..... کیا حرج ہے.....؟'' ماموں جان نے حسب سابق اس کی حمایت کی۔

''جانے دو بھئی، خوش ہو جائے گی۔'' ابو کی مضبوط سفارش نے اسے خوش کر دیا اور امی کو ناچار اجازت دینا پڑ گئی۔

''ماموں جان کب چلنا ہے.....؟'' اس نے پوچھا۔

''کل چلیں گے بیٹا.....! تم تیاری کر لو۔'' انہوں نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے حیدر آباد جائیں گے، وہاں سے قیوم کو لے کر نوکوٹ چل دیں گے۔''

''قیوم کون ماموں.....؟''

''دوست ہے..... ٹی وی پر ملازم رہ چکا ہے۔''

وہ ایک دم پرجوش ہو گئی اور تیاری میں لگ گئی۔ عجیب سی خوشی کا احساس اس پر حاوی تھا۔

♦ ♦ ♦

وین میں وہ اپنے پسندیدہ اداکاروں کے درمیان بہت چہک رہی تھی۔ وہ خود بھی اس قابل تھی کہ لوگ اس کی قربت میں خوشی محسوس کریں۔

''افتخار صاحب.....! آپ نیلوفر کو ایک ڈرامے میں ضرور چانس دیں، لوگ پسند کریں گے۔'' ڈرامے کے ہیرو علی رضا نے گویا سفارش کی۔

''بھی نیلو کی والدہ رضامند نہیں ہیں ورنہ میں تو کوئی قباحت نہیں سمجھتا اگر میں نے اس طرح کی کوئی حرکت کر دی تو گھر سے نکال دیا جاؤں گا۔'' افتخار صاحب نے شگفتگی سے کہا۔

نیلوفر کا منہ بن گیا۔ اپنی پیاری ماں کی اسے بس یہی بات ناپسند تھی۔ ''اونہہ ہر وقت خاندان والوں کا خیال، پتہ نہیں کیا دیں گے یہ خاندان والے۔'' اس نے سلگ کر سوچا۔

دوپہر ڈھلے وہ لوگ حیدر آباد پہنچے۔ قیوم نے پرتپاک استقبال کیا اور مزیدار کھانا کھلایا۔ گویا حق میزبانی ادا کیا۔

چار بجے سے پہلے وہ نوکوٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔ قیوم صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ وین کی رفتار اس بار تیز تھی۔ نیلوفر نے اپنی برجستہ باتوں سے ساری وین کو زعفران زار بنا رکھا تھا۔

نوکوٹ پہنچ کر انہیں بہت خاموشی اور سکون کا احساس ہوا۔

افتخار صاحب اور نقاش صاحب (رائٹر) گاؤں کے لوگوں میں گھل مل کر معلومات حاصل کرنے لگے۔

ڈرامے کی ہیروئن حسنہ، کریکٹر ایکٹریس عابدہ بخاری، ایک اور معاون اداکارہ صائمہ ارشد کے ہمراہ وہ ایک بے حد صاف ستھرے گھر میں بیٹھی تھی۔ گھر کی عورتیں ان کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ انہیں بھی بے حد باتونی شرارتی نیلوفر بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ بڑے سے کچے صحن میں بیٹھ کر پرسکون اور اجنبی ماحول اسے بے حد اچھا لگا۔ گاؤں کی دیگر خواتین بھی تھیں جو ان سب کو دیکھنے آ گئی تھیں۔ اسی دم سامنے کمرے کا نیم وا بھاری پٹ مزید کھلا اور ایک وجیہ نوجوان جو کچے شعور کو الوداع کہہ رہا تھا، باہر نکلا مگر سامنے بیٹھی ہوئی ''میم صاحبو'' کو دیکھ کر ٹھٹک گیا بلکہ تھوڑا سا جھینپ گیا۔ بوڑھی عورت نے سندھی میں کچھ کہا تو وہ سر جھکائے باہر چلا گیا۔ شاید بوڑھی عورت نے کوئی عام سی بات کی تھی ورنہ حسنہ جو سندھی پر عبور رکھتی تھی، اس کا ترجمہ کر کے ضرور بتا دیتی۔

تھوڑی دیر بعد افتخار صاحب نے آ کر کہا۔ ''آپ لوگ آرام کیجئے، شام گہری ہو چلی ہے۔ کل انشاء اللہ آپ کو سائٹ پر لے چلیں گے اور کام شروع کر دیں گے۔ اس وقت نقاش صاحب ذرا باہر جا رہے ہیں۔''

''ماموں جان میں بھی چلوں.....؟'' وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

''فولاد سے ڈھلی ہو نیلوفر.....؟'' عابدہ بخاری تھکی تھکی ہنسی کے ساتھ بولی۔

''گڑیا تم بھی آرام کرو..... مزید تھکو گی خواہ مخواہ۔'' افتخار صاحب نے سمجھایا۔

''ماموں جان، آرام تو کرتی رہتی ہوں۔ دل چاہ رہا ہے۔'' وہ منہ بسور کر بولی تو ناچار انہیں لاڈلی بھانجی کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

ماموں جان وین خود ڈرائیو کر رہے تھے کیونکہ ڈرائیور تھک کر سو چکا تھا۔ ان کے ہمراہ

جوشیلے سے نقاش صاحب بھی تھے۔ نیلو کا خیال تھا کہ وہ پچھلی نشست پر پاؤں پسار کر آرام سے باہر کا نظارہ کرے گی مگر اس کا پروگرام فیل ہو گیا۔ شام والا نوجوان ماموں جان کے عین پچھلی نشست پر براجمان تھا۔ غالباً اسے بطور گائیڈ ساتھ لے لیا گیا تھا۔ نیلوفر چاہتی تو لیٹ سکتی تھی مگر جانے اس نوجوان میں کیا بات تھی کہ وہ کسی بے تکلفی کی متحمل نہ ہو سکی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔

باہر جھانکتے ہوئے اس نے کئی بار اس نوجوان کو بھی دیکھا جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ کبھی ماموں جان اس کی اور وین کی خاموشی توڑ دیتے۔ ''شاہ نواز.....! اس طرف.....؟''

تب وہ راہنمائی کے کلمات منہ سے نکالتا پھر چپ سادھ لیتا۔ نیلوفر نے بارہویں کی چاندنی میں نہائے باہر کے پراسرار یکساں مناظر سے اُکتا کر وین میں نظریں گھمانا شروع کیں۔ فرنٹ سیٹوں کی اُونچی اُونچی پشتوں سے ماموں جان اور نقاش صاحب کے صرف بال نظر آ رہے تھے۔ اس نے برابر کی سیٹ پر بیٹھے شاہ نواز کو دیکھا جو اب بازوؤں پر آستین سمیٹ رہا تھا۔ اس کے مضبوس، محنت کرنے والے بازو وین کی مدہم روشنی میں خون چھلکاتے محسوس ہو رہے تھے اور ادھ کھلا گریبان فراخ سینے کی جھلک دکھا کر عمر کی مضبوطی کا اعلان کر رہا تھا۔

نیلوفر نے اس پر سرسری نظر ڈالی تھی مگر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نوجوان میں عجیب سا جادو ہے۔ وہ ناسمجھ اور کم عمر لڑکی نہیں جانتی تھی کہ جادو جسم میں کم اور عمر میں زیادہ ہوتا ہے۔ کچی اور اندھی عمر کے جذبے بعض اوقات انسان کو پتھروں کے زمانے میں بھی لے جاتے ہیں۔ اس نے بہت کچھ محسوس کیا مگر سمجھ نہ سکی۔ بس ایک نتیجے پر پہنچی کہ اس سے بات کرنا چاہیے۔

''سنیں اس نے آہستگی سے کہا۔

نوجوان چونک پڑا..... اس نے نظریں اُٹھا کر ''سنہری بلی'' کو حیرت سے دیکھا۔

''آپ اسی گاؤں میں رہتے ہیں.....؟'' نیلو نے بے سروپا سوال کیا تو نوجوان نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''پڑھتے ہیں آپ.....؟'' اس کے سوال مسلسل بچکانہ تھے۔

نوجوان نے اسے دیکھا پھر انکار میں گردن ہلا دی۔

''آپ کیا کام کرتے ہیں.....؟''

''ہاری کا بیٹا ہوں، کھیتوں پر کام کرتا ہوں۔'' اس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

نیلوفر پر پانی سا پڑ گیا۔

وین رُک گئی۔ چاندنی میں نہایا صحرا سناٹوں کے ہمراہ عجیب سا خوف پیدا کر رہا تھا۔ نقاش صاحب صحرا کو دیکھ کر بڑے جذباتی ہو گئے تھے اور افتخار صاحب کے ساتھ بے تکان گفتگو میں مصروف تھے۔ سب وین سے اُتر کر پیدل چلنے لگے۔ اس نوجوان کا رویہ حسب سابق تھا۔ وہ پشت پر ہاتھ باندھے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

''ارے بھئی نیلو.....! بور ہو رہی ہو ناں.....؟'' معاً ماموں جان کو بھانجی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

''نہیں ماموں جان، بالکل بور نہیں ہو رہی بلکہ خاموشی سے اس بھیانک صحرا کو دیکھنے میں بہت لطف آ رہا ہے۔'' اپنی بات کے اختتام پر وہ ہنس پڑی۔ خوبصورت ہنسی۔ چاند پر سے بادل گزرا تو صحرا بھی پہلو بدلتا محسوس ہوا۔ نوجوان نے اس کی دل کش ہنسی پر مسحور ہو کر لمحے بھر کو اسے دیکھا۔

''یہ میرے ماموں ہیں۔'' نیلوفر نے افتخار صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ ''لوکیشن منتخب ہونے اور کیمرہ چلنے تک یہ لوگ اسی طرح اپنی بھوک پیاس سے غافل رہیں گے۔ آپ کو بھی گھاس نہیں ڈالیں گے۔ میرا مطلب ہے، آپ سے بھی بات نہیں کریں گے۔ کیوں نہ آپ مجھے تھر کے اس حصے کے بارے میں بتائیں۔''

وہ چند ساعت خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔ ''کیا بتاؤں بی بی۔ صحرا، صحرا ہے، خشک بیابان۔ دن کو دُھوپ میں تپتا ہے، چاند کے دن ہوں تو رات کو چاندنی ہے یہاں۔ تارے یہاں البتہ ہمیشہ چمکتے ہیں۔'' وہ بھری کیسٹ کی طرح بج کر یکدم خاموش ہو گیا۔

نیلو نے یہ ادبیانہ قسم کی تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ اس کا خیال تھا، وہ اسے تھر کی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرے گا، مگر اس اکھڑ اور بدمزاج نوجوان کی معلومات صرف چاند ستاروں کی حد تک محدود تھیں۔ اچانک کوئی پرندہ عجیب و غریب آواز میں چیختا اور پھڑ پھڑاتا ہوا ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ ایسی مکروہ اور اتنی بھیانک تھی وہ آواز کہ نیلو نے بے ساختہ اپنی موی اُنگلیاں نوجوان کے بازو میں گاڑ دیں۔ ''یہ..... یہ کیا.....؟'' وہ ہکلا کر رہ گئی۔

نوجوان نے ہلکے سے اپنا بازو اس کی اُنگلیوں سے آزاد کرا کے بے نیازی سے کہا۔ ''ہوگا

جی کوئی رات کا پرندہ۔"

نیلو کا جی چاہا، وہ اس سے پوچھے کہ رات کے پرندے کیسے ہوتے ہیں یا رات کا پرندہ کسے کہتے ہیں مگر نوجوان کا انداز اتنا سرد تھا کہ وہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اسے خود پر غصہ آیا۔ "اونہہ.....! کیا ضرورت ہے اس دیہاتی اَن پڑھ کے رعب میں آنے کی۔" پھر وہ ایک لفظ نہ بولی اور بھاگ کر ماموں جان اور نقاش صاحب کے پاس پہنچ گئی۔

♦ ♦ ♦

اگلے روز وہ جلد ہی تھر پہنچ گئے۔ کافی دیر تو چھول داریاں نصب کرنے میں مصروف رہے، اس کے بعد منتخب جگہ پر کیمرے نصب کر دیئے گئے۔ عابدہ بخاری اور علی رضا پر کچھ عکس بندی کی جانے لگی۔ ماموں جان دن بھر کام میں غرق رہے۔

شام کو وہی نوجوان اشیائے خورد و نوش لے کر آ گیا۔ ماموں جان، وہ نوجوان اور نقاش صاحب تو تیتر بھوننے میں اور باقی ارکان خوش گپیوں میں لگ گئے۔ رات ہوئی تو ماموں جان نے چاندنی میں نہائے صحرا اور چمکتے چاند کے کچھ مناظر سلولائیڈ پر منتقل کیے۔ پھر ستانے کے لئے کارکنوں کے ہمراہ اپنی چھول داری میں چلے گئے۔ چونکہ نیلوفر شام کو دیر تک پڑی سوتی رہی تھی، اس لئے رات کو نیند ہی نہیں آ رہی تھی جبکہ سب لوگ آرام کر رہے تھے۔ وہ دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر باہر نکل آئی۔ آج اسے سناٹے سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بہت مگن تھی۔ اسی دم گزشتہ رات والے پرندے کی کریہہ آواز آئی اور پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا اس کے سر پر سے گزر گیا۔ وہ بے ساختہ نیچے بیٹھ گئی اور سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ دل دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ اسی لمحے کئی پرندوں کی چیخیں بلند ہوئیں۔ پرندے اس کے سر پر منڈلانے لگے۔ اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ پرندے عجیب بھیانک رقص کر رہے تھے۔ ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ عین اس کے سر پر ہو رہی تھی۔ وہ بھاگنا چاہ رہی تھی مگر بے بس تھی۔ معاً پرندے اُونچی پرواز کر گئے۔ کسی نے اس کا بازو تھام کر اُٹھایا۔ اس کی آتی جان پھر جانے لگی۔ اس نے ہمت کر کے گردن موڑی، سامنے وہی نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا رومال تھا۔ صحرا کی بھیانک رات اور سائیں سائیں کرتی ہوائیں، ایک ڈراؤنا منظر پیش کرنے لگی تھیں۔ وہ لرزتی ہوئی اس سے

تک گئی۔ ٹانگیں ایک دم بے جان ہو رہی تھیں۔ وہ اس کے سہارے خود کو گھسیٹنے لگی۔

''کک.....! کیا یہ پرندے آدم خور ہیں.....؟'' اس نے اپنا سارا بوجھ شاہ نواز کے بازو پر ڈال کر مردہ سے انداز میں پوچھا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

''آپ نے گدھ کا نام سنا ہے.....؟ بھوک لگتی ہے تو شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر اُڑنے لگتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر بیٹھنا نہیں چاہئے۔ یہ مردہ سمجھ کر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ چلتے رہنا چاہئے۔ ویسے تو یہ ہر حالت میں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' اس کی بری حالت کے پیش نظر شاہنواز نے اسے مضبوطی سے تھام لیا مگر انداز میں وہی بے نیازی اور سرد مہری تھی۔ اس کے باوجود احساس سے بے خبر نہ رہ سکی، حالانکہ اس کے لڑکپن کی آہٹیں ابھی معدوم نہیں ہوئی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی لیکن اس کا ساتھ اسے ایک دم اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ خاندانی اور شرمیلی لڑکی تربیت اور اکتساب کے طلسم سے باہر آنے لگی۔ اس وقت وہ متمدن اور مہذب لڑکی نہ رہی۔ پتھر کے زمانے کی یکسر لاعلم لڑکی بن گئی۔ اس کا جی چاہا، سامنے نظر آنے والی چھول داریاں دُور پرے گاؤں کی چھتوں میں کھسک جائیں۔ فاصلے طویل ہو جائیں اور وہ اس کے سہارے یوں ہی چلتی رہے۔

کیا یہ ستم کم تھا کہ وہ کچی عمر کی تھی، اس پر دوہری افتاد کہ پتھر کے زمانے کی ہو گئی تھی۔ غیر متمدن، غیر مہذب، بیوقوف جس کی ہتھیلی پر دماغ کی لکیر نہیں تھی صرف دل کی لکیر تھی۔

''بی بی.....!''

''میرا نام نیلوفر ہے۔'' وہ کھوئی ہوئی تھی۔

''آپ کے پاؤں میں چوٹ تو نہیں لگی ہے اور پرندے تو کب کے دُور جا چکے۔ میرا بازو چھوڑ دو بی بی.....!'' اس کا لہجہ محتاط تھا مگر نیلو کو سنگین لگا۔ وہ چونک پڑی۔ منظر میں توازن نہیں تھا۔ وہ شہر سے پتھر کے زمانے میں چلی گئی تھی مگر وہ گاؤں سے اس زمانے میں نہیں جا رہا تھا۔ ہوش آیا تو ایک دم انا پرست متمدن امیر زادی بن گئی جسے ایک ''چھوتے'' نے شکست دے دی تھی۔ یہ احساس جان لیوا ہو گیا کہ اسے غلط نہ سمجھ لیا گیا ہو، لہٰذا اسے جتا دیا جائے کہ وہ ایک مہذب امیر زادی ہے اور اچھے اچھوں کو گھاس نہیں ڈالتی۔ وہ تو ذرا ''ڈر'' گئی تھی، بس اسی طرح دوسرا خیال یہ اُبھرا کہ اس نے جس طرح اس کی انا کو مجروح کیا ہے، اس کا بدلہ بھی اُتار

دیا جائے۔اس ''ملنگ'' کا نقاب کھینچ ڈالے اور اسے بھی تھوڑا سا مجروح کر کے بے نیاز بن جائے۔اس طرح آن کو تاوان مل جائے گا اور وہ یہ باور کرانے میں بھی کامیاب ہو جائے گی کہ وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں ہے! نیلوفر کو اس کا سنگین لہجہ نہیں بھول رہا تھا۔آخر وہ کیا جتانا چاہ رہا تھا.....؟''بی بی میرا بازو چھوڑ دو۔'' اونہہ، اس کا ذہن کھول اُٹھا۔وہ دوڑی اور چھول داری کا پردہ اُٹھا کر اندر چلی گئی۔

♦ ♦ ♦

نوکوٹ کے لئے ان کا محض تین دن کا پروگرام تھا۔صحرا میں ابھی تک چھول داریاں نصب تھیں۔شاہ نواز چلا جاتا تھا پھر ضروری چیزیں لے کر آ جاتا تھا۔رات اسے زبردستی روک لیا گیا تھا کیونکہ وہ بہت سے کاموں میں ہاتھ بٹا سکتا تھا۔رات کو جب وہ ''چہل قدمی'' کے لئے نکلی تھی۔وہ چھول داری کے باہر زمین پر بیٹھا تھا اور کیونکہ اوٹ میں تھا، اس لئے وہ اسے نہ دیکھ سکی تھی۔تبھی وہ بروقت مدد کے لئے پہنچ گیا تھا۔

شاہ نواز ایک نرم گرم دل کا حامل مگر بے حد سادہ انسان تھا۔رات جو بات ہوئی تھی وہ اس عمر میں بغیر جتائے بتائے ہی سمجھ آ جاتی ہے۔وہ سمجھ رہا تھا کہ ''سنہری بلی'' اب اس سے بات بھی نہیں کرے گی۔رات کو اس کا انداز یہی بتا رہا تھا مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب نیلو نے اسے مسکراتے ہوئے چائے کا مگ پیش کیا۔افتخار صاحب کی چھول داری میں وہ سب ناشتا کر رہے تھے۔

''شاہ نواز تم ناشتے میں تو خالص مکھن کھانے کے عادی ہو گئے، اگر پسند کرو تو اپنے توس پر لگاؤ اور کھاؤ، انگریزی ناشتا کرو۔'' نقاش صاحب نے اس کی مدارت کی۔

شاہ نواز کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے۔اس نے گڑبڑا کر ان کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی۔دو دن میں وہ ان سے کافی گھل مل گیا تھا۔

نیلو نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا پھر جانے کیا سوچ کر مسکرا دی۔

دوپہر کو ڈرامے کی عکس بندی کے دوران میں وہ ایک مصنوعی رائفل اُٹھا کر شاہ نواز کے پاس آ گئی جو ایک ٹیلے پر بیٹھا بڑے اشتیاق سے فنکاروں کو مکالمے بولتے اور اداکاری کرتے

دیکھ رہا تھا۔ نیلو کو سامنے دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

''شاہ.....!'' نیلو نے اس کا اُدھورا نام لے کر تکلف کا آخری پردہ چاک کیا۔

اس نے خالی نظروں سے پر اعتماد سی نظر آنے والی لڑکی کو دیکھا۔

''سنو.....! تمہیں رائفل چلانا آتی ہے.....؟''

''جی میں نے کبھی چلائی نہیں، نوبت ہی نہیں آئی۔'' وہ سر جھکا کر سادگی سے گویا ہوا۔

''یہ بتاؤ، کیا تم بہادر ہو.....؟'' نیلو نے معصومانہ انداز میں دریافت کیا۔

''بہادر تو ہونا چاہئے جی مرد کو۔'' وہ پہلی بار اس کے چہرے کی سمت دیکھ کر بولا۔

نیلو نے رائفل کی نال اس کے سینے سے ٹکا دی۔ ''میں ایک، دو، تین کہوں گی اور گھوڑا دبا دوں گی۔ ٹھیک.....؟''

شاہ نواز اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ وہ تو اسے سمجھدار خیال کر رہا تھا مگر اس کی حرکتیں تو بالکل بچوں ایسی تھیں۔

نیلو نے ایک، دو، تین کہا اور گھوڑا دبا دیا۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔

''ارے تم تو بالکل نہیں ڈرے۔'' وہ حیرانی سے بولی۔ ''اچھا بتاؤ کیوں نہیں ڈرے.....؟''

''مجھے پتا تھا یا تو یہ بندوق خالی ہوگی یا نقلی ہوگی۔ جو لڑکی پرندوں سے ڈر کر ایک گھنٹا کانپتی ہے، وہ کسی کو مار سکتی ہے؟ کسی پر گولی چلانا آسان تو نہیں ہوتا بی بی.....!''

سورج نیلو کے سامنے تھا۔ اس نے آنکھیں چندھی کر کے شاہ نواز کو بغور دیکھا اور رائفل کی نال زمین سے ٹکا دی۔ ''ارے تم تو اچھے خاصے سمجھدار ہو پھر پڑھ لکھ کر کچھ بن کیوں نہیں جاتے.....؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''بارہ جماعت پڑھا ہوں بی بی.....! آگے بابا نہیں پڑھنے دیتا۔ اسے کھیتوں پر اکیلے کام کرنا پڑتا ہے۔''

''ارے.....! تم انٹر ہو.....؟ واہ..... ویسے مجھے تم پہلے ہی سب سے مختلف دکھائی دیئے تھے۔'' وہ اپنے صحیح اندازے پر خوش ہو کر بولی۔ ''ارے تم تو اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہو۔ آگے ضرور پڑھو، بی اے کر لو۔ اپنی انگریزی امپروو کرو پھر سول سروس کا امتحان پاس کر لینا۔''

اس نے کھڑے کھڑے شاہ نواز کا مستقبل بنا دیا۔ ''سچ، بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ سندھ ڈومیسائل بیس پر تمہارا اسی ایس ایس کا امتحان بے کار نہیں جائے گا۔'' وہ جانے کیا بول رہی تھی۔ شاہ نواز کے کچھ پلے پڑا اور کچھ نہیں۔

''آپ کہاں رہتی ہیں بی بی.....!''

''کراچی میں، النور سوسائٹی میں..... سچ، تم ضرور آگے پڑھو۔ بڑے آدمی بن سکتے ہو۔ اچھے خاصے ذہین ہو۔''

''کیا کروں گا بڑا آدمی بن کر.....؟'' اس نے اپنی آس بھری نظریں نیلو پر جمائیں۔

''ارے بھئی عجیب بے وقوف ہو۔ کیا کرتے ہیں بڑے آدمی بن کر؟ عزت ملتی ہے، نام ہوتا ہے۔'' وہ اس کی نظروں سے بچتی ہوئی بولی۔

''آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں بڑا آدمی بنوں.....؟''

نیلو کو تاؤ سا آ گیا۔ اس نے بیزاری سے شاہ کو دیکھا۔ اسے شاہ نواز کا سوال جائز لگا اور اپنی نظروں کا گناہ یاد آ گیا۔ وہ تیر چھوڑ کر بھول گئی تھی مگر زخم خوردہ تو نہیں بھول سکا تھا کہ تیر تو اسے لگا تھا۔ سیاہ ملیشیا کی قمیص شلوار میں کہنیوں تک آستینیں چڑھائے وہ پسینے میں بری طرح بھیگ رہا تھا اور اس کی طرف دیکھے ہی جا رہا تھا۔

''بھئی ایسے ہی کہہ دیا تھا، تم ذہین جو ہو۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

''آپ نے کہا تو بھی کر دکھاؤں گا مگر ایسا نہ ہو کہ میں کچھ بن جاؤں اور آپ پہچاننے سے ہی انکار کر دیں۔'' اس کی آواز بزدلوں کی طرح بے حد دھیمی ہو گئی۔

نیلوفر نے گڑبڑا کر اس کی سمت دیکھا۔ اس کی حماقت اور کم عقلی کے شرر شاہ کی آنکھوں سے پھوٹنے لگے تھے اور شاہ نواز کی ساری مردانگی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ نیلو کی رگ رگ میں نسوانیت لہو بن کر دوڑنے لگی۔

''بی بی.....! کوئی کم پڑھا لکھا ہو یا زیادہ، سمجھتا سب کچھ ہے۔ اگر میری کسی پچھلی بات سے آپ کا دل دُکھا ہو تو معاف کر دینا۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھ گیا اور نیلو پر نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت غالب آ گئی۔

اگلے روز چھول داریاں سمٹ کر وین میں پہنچ گئیں اور دیگر ساز و سامان بھی۔ افتخار صاحب نے بتایا کہ تھوڑا بہت کام گاؤں میں کرنا ہے۔ شام پانچ بجے واپسی ہوگی۔ نیلوفر کو بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ وین کی آخری سیٹ پر جا کر لیٹ گئی۔

''ارے کیا ہوا.....؟'' عابدہ بخاری ایک دم پریشان ہو گئیں۔

''کچھ نہیں آنٹی، بس ایسے ہی تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔''

''اگر سر میں درد ہو تو مجھ سے ٹیبلٹ لے لینا۔''

''کیا ہوا نیلو.....؟'' حسنہ نے سیاہ گلاسز اپنی ناک پر جماتے ہوئے پوچھا۔

''اُف اللہ.....! آپ لوگ تو ایسے ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ نیند پوری نہیں ہوئی اس لئے سستی سی چھا رہی ہے۔ ماموں جان کو بتا دیجئے گا ورنہ پریشان ہو جائیں گے، آپ لوگوں کی طرح۔'' اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور سو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب اسے جگا کر اُترنے کو کہا گیا تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ افتخار صاحب نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔ ''اُٹھو گڑیا، سفر میں بھی کوئی اتنی گہری نیند سوتا ہے.....؟''

وہ جھلا کر اُٹھ بیٹھی، نیند آنکھوں میں بھری ہوئی تھی۔

''اُٹھ جاؤ، شاباش بیٹا.....! پھر روانگی بھی ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اُتر گئے۔ نیلوفر وین سے اُتر تو گئی مگر کچی نیند سے اُٹھنے پر بچوں کی طرح منہ بسور رہی تھی۔

میزبان خاتون نے سندھی میں عابدہ بخاری سے کہا کہ وہ لوگ منہ ہاتھ دھو لیں اور کھانا کھا لیں۔

نیلو پیشانی پر بل ڈالے جھلائی ہوئی بیٹھی تھی۔ عابدہ بخاری نے پیار سے اس کا چہرہ تھام کر منہ ہاتھ دھونے کو کہا۔ وہ واقعی کچھ ایسی کشش رکھتی تھی کہ بے ساختہ پیار کرنے کو جی چاہے۔

''آنٹی صحرا میں بھی کوئی سویا جاتا ہے۔ کیا ہوتا اگر آپ لوگ اُتر آتے اور مجھے وین میں سونے دیتے۔ جب نیند پوری ہو جاتی، میں اُتر کر آ جاتی۔''

وہ نخرے سے بولی۔

شاہ نواز کی سیدھی سادی بہنیں سمجھیں، شہزادی صاحبہ بغیر ہلے ہی کام کرنا چاہتی ہیں۔ وہ

بے چاریاں لوٹا، تسلہ، صابن، تولیہ لے کر اس کی خدمت کو آ گئیں۔

''ہائیں، یہ کیا ہو رہا ہے.....؟'' اسے مزید تاؤ آ گیا۔ ''میں معذور ہوں آنٹی، جو یہ لوگ اس طرح میرا منہ ہاتھ دُھلانے آئے ہیں.....؟'' وہ چڑ چڑے پن سے بولی۔

''خدانا خواستہ.....! سیدھی سادھی بچیاں ہیں، حق میزبانی ادا کر رہی ہیں، اگر تم سونا چاہتی ہو تو سو جاؤ۔ روانگی تو چار بجے ہے ناں، اُٹھا دیں گے تمہیں۔'' عابدہ شفقت سے بولیں اور مڑ کر سندھی میں لڑکی سے کچھ کہا۔ لڑکی نیلو کا ہاتھ تھام کر ایک کمرے میں لے گئی۔ ابھی ڈھنگ کی گرمیاں شروع نہیں ہوئی تھیں اور کمرا کچھ ٹھنڈا بھی تھا۔ وہ لکڑی کے بدرنگ پلنگ پر گرتے ہی سو گئی۔ وہ نیند کی کمی برداشت نہ کر پاتی تھی۔ بقول ماں کے وہ سوائے سونے کے کسی کام میں باقاعدہ نہیں تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی۔ عجیب پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پھر بزدلوں کی طرح ڈر گئی۔ نیند پوری ہو چکی تھی۔ وہ اپنی پرانی حالت پر واپس آ چکی تھی۔

وہ باہر آئی تو خاتونِ خانہ چھاج میں کچھ پھٹک رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ دُھلوانے میں انہوں نے مدد کی۔ اس نے ہینڈ بیگ میں سے برش نکال کر بال بنائے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب لوگ کہاں ہیں؟ ہو سکتا ہے عکس بندی میں مصروف ہوں۔ اس نے بڑی بی سے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں پوچھنے کی کوشش کی جس کے جواب میں بڑی بی اتنی روانی سے بولیں کہ اس کے کچھ بھی پلے نہ پڑا۔ وہ وہیں موڑھے پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگی۔ اسی دم شاہ نواز بڑی سی بالٹی اُٹھائے اندر آیا۔

''سنو.....! یہ سب لوگ کہاں ہیں.....؟''

وہ چھوٹے سے گودام نما کمرے میں جاتے جاتے رُک گیا۔ ''صاحب لوگ باہر بیٹھے ہیں۔ بیبیاں گاؤں کی عورتوں سے ملنے گئی ہیں۔''

''گاؤں کی عورتیں کہاں ہیں.....؟'' اس نے بے تکا سوال کیا۔

''اپنے اپنے گھروں میں۔'' وہ سکون سے جواب دے کر بالٹی میں جانے کیا اُٹھا اُٹھا کر ڈالنے لگا۔

نیلو خجل سی ہو گئی۔ بعض اوقات پتا نہیں احمقانہ بات کیوں منہ سے نکل جاتی ہے؟ تبھی وہ

گودام کے دروازے کی زنجیر چڑھا کر باہر آ گیا۔

''بی بی میں نے سوچ لیا ہے کہ پڑھوں گا۔''

نیلو نے چونک کر شاہ نواز کو دیکھا۔ اب تک وہ گزشتہ جذبوں کی گرفت سے خود کو آزاد کر چکی تھی۔ بے اعتنائی سے بولی۔ ''اچھا فیصلہ ہے، پڑھائی اچھی چیز ہے۔'' اس نے سرسری انداز میں تعلیم کی افادیت پر خیال آرائی کی۔

وہ اپنے اَدھ کھلے بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''آپ کراچی میں کس جگہ رہتی ہیں.....؟''

''نیلوفر نے چور نظروں سے اس کے مضبوط سراپے کو دیکھا۔ ''بتایا تو تھا تمہیں، النور میں۔ تم آؤ گے ہمارے ہاں.....؟''

''ہوسکتا ہے۔'' اس کا لہجہ جذبوں سے بوجھل ہو چلا تھا۔

وہ ایسے ہی اس کی کسی مشکل بات سے بچاؤ کی خاطر بولی۔ ''تمہارا پورا نام کیا ہے.....؟''

''شاہ نواز.....شاہ نواز سومرو.....ویسے بی بی۔'' وہ ایک موڑھے پر پاؤں ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ ''ویسے نیلو بی بی.....! آپ نے مجھے بہت حیران کیا ہے۔ اللہ سائیں نے آپ کا دل.....''

''ارے بھئی نیلو اُٹھ گئیں.....؟ بھئی سب لوگ وین میں بیٹھ چکے ہیں، جلدی کرو۔'' حسنہ شور مچاتی آ گئیں۔

''اچھا شاہ.....! خدا حافظ.....!''

شاہ نواز کی ماں کو گھر سے برآمد کر کے اس کا بھی شکریہ ادا کیا گیا اور وہ لوگ باہر کھڑی وین میں بیٹھ گئیں۔

سب لوگ وین میں بیٹھے نوکوٹ کی گھڑیاں دُہرا رہے تھے۔

''تم تو بور ہو نیلو.....! سو گئی تھیں۔ سچ ہم تو پورے گاؤں میں گھومے.....کام کرنے کا مزہ تو اب آئے گا۔ یہاں کا مشاہدہ بہت کام آئے گا۔ کیوں عابدہ باجی.....؟'' حسنہ نے بات کے اختتام پر تائید چاہی۔

''ارے حسنہ.....! افتخار صاحب تو مجھے پہلے دن ہی مبارک باد دے چکے ہیں کہ بالکل سندھن لگ رہی ہو۔ تمہاری یہ بات بالکل صحیح ہے کہ کراچی جا کر کام کرنے کا مزہ تو واقعی اب آئے گا۔ سچ تو یہ ہے، افتخار صاحب نے بہت محنت کی۔ اپنی لاڈلی بھانجی تک کو فراموش کر دیا کام کے دوران۔''

''ارے نہیں بھئی، کیوں گھر جا کر میری شامت بلوانے کے سامان کر رہی ہیں آپ لوگ۔ وہ تو مجھے آپ سب پر بھروسہ تھا کہ نیلو کا خیال رکھیں گے۔''

افتخار صاحب بے ساختہ صفائی پیش کر گئے۔ وین میں قہقہے گونج اُٹھے۔

آتے ہی وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ چند ماہ بعد امتحانات کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ اپنے کمرے میں یا کبھی چھت پر اسٹڈی کرتے ہوئے نوکوٹ کا ''جی دار'' اسے کئی بار یاد آیا۔ کبھی یاد احساسِ جرم دے جاتی اور کبھی پیشانی عرق آلود کر جاتی۔ کبھی کبھی، بارہا ان یادوں نے اس جی دار کی شرافت کا اعتراف کرایا۔ وہ کمزور روایتوں کا مضبوط مرد تھا۔ اسے بارہا تأسف ہوا، اپنی انا کی لمحاتی شکست کا بدلہ اس سادہ سے نوجوان کو خوش فہمی میں مبتلا کر کے لینا بڑی سزا تھی۔ اس کی ذات کی میزان زور زور سے ہلتی اور ضمیر حقائق چمکاتا کہ نہیں۔ نیلو بی بی، انا کی جراحی سے قبل تم قصور کر چکی تھیں، تمہاری آنکھوں، تمہارے لہجے نے اس پر پہلے وار کر دیا تھا۔ پھر وہ خود ہی اپنے دفاع میں سوچتی۔ ''میرا دماغ خراب نہیں تھا، وہ ایک دیہاتی نوجوان ہے، میں نے کیا کیا ہے۔ ہنس کر بات کر لینا کوئی جرم ہے؟ میں تو سب سے اسی طرح ملتی ہوں۔'' لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ وہ کمزور لمحہ جو پتھروں کے زمانے میں لے جا رہا تھا، محض اس کی نیکی سے شکست کھا گیا تھا۔

وہ ضمیر سے شکست کھا گئی۔ اسے اعتراف کر لینا پڑا کہ واقعی اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس پر ادراک و آگہی کے در وا ہوئے تو اسے معلوم ہوا کہ کمزور لمحے کیا ہوتے ہیں۔ دراصل وہ توجہ آشنا لڑکی تھی۔ وہ ایک بھرپور اور مکمل مرد کی نظر اندازی نہ سہ سکی تھی۔ شاید اس کی انا پر بن گئی تھی۔ اس سے وہ جرم سرزد ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس غیر شعوری حرکت پر اسے سراسر ندامت تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے کسی اچھی لڑکی کے شایانِ شان کام نہیں کیا۔ وہ سخت حیران تھی کہ یا اللہ اس میں کیا جادو تھا جو میں نے اسے اتنی اہمیت دی تھی؟ دراصل منفرد چیز

ضرور چونکاتی ہے۔ خدا نے اسے اس طرح ڈھالا تھا کہ جو ملتا اس کا تمنائی ہو جاتا۔ ایک وہی تھا جس نے نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ پورے گاؤں نے انہیں اس طرح دیکھا تھا گویا اُڑن طشتری سے گرے ہوں۔ خاص طور پر نیلوفر کو سب نے بہت اہمیت دی۔ بلی جیسی آنکھوں والی لڑکی جو بڑی بے تکلفی سے ہنستی اور دل موہ لیتی۔ اس کی جذباتی کوتاہیوں نے اسے خود پسند اور سستا ثابت کیا تھا۔ تربیت میں کوتاہی ہوگئی ہوگی۔ خون میں نہیں تھی لہٰذا اسے سوچ سوچ کر کوفت ہوتی کہ ایسی احمقانہ حرکت اس سے سرزد ہوئی ہے۔ چند دن تک تو احساسِ ندامت اور کوفت کی شدت رہی پھر تیز رُو دُنیا اسے ساتھ بہانے لگی اور وہ بہنے لگی مگر اب اس کا لا اُبالی پن ختم ہو گیا تھا۔ وہ بہت بردبار نظر آنے لگی تھی۔

پھر ایک روز اسے معلوم ہوا کہ اس کی خالہ نے اسے اپنے ہونہار سپوت کے لئے مانگا ہے۔ اس کی روایت پرست ماں پھولی نہ سمائی۔ رشتہ بہت مناسب تھا۔ وہ سگی خالہ کا گھر تھا گویا میکا بھی تھا اور سسرال بھی۔ اس سے بھی پوچھا گیا۔ ماموں کے زور دینے پر۔ مگر انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ خاموش رہی۔ اس کی خاموشی کو اقرار کا نام دے دیا گیا۔ اب وہ ماں کو کیا بتاتی کہ ایک دیہاتی کو اُلو بناتے بناتے وہ خود کتنی بڑی بے وقوف ثابت ہوئی ہے۔ اس نے نسوانیت کے خلاف عمل کر کے ایک مرد کی نگاہ میں عورتوں کو گرانے کا جرم کیا ہے۔ پھر سوچا وہ آ بھی جائے تو کیا کر لے گی؟ ہو سکتا ہے وہ فراموش کر بیٹھا ہو۔ اسے اپنی اوقات یاد آ گئی ہو۔ اسے اپنا مقام معلوم ہو گیا ہو۔ وہ فطرتاً حساس لڑکی تھی، بہت جلدی پریشان ہونے والی۔ ''یہ میں نے کیا حماقت کی، اسے اپنا پتا بھی بتا دیا۔'' اسے اپنی غلطیوں کی زنجیر میں ایک اور کڑی دکھائی دی۔ اس کے سارے خدشوں کا لب لباب یہ تھا کہ وہ آ نہ جائے اور اپنی سادگی سے نئے گل نہ کھلا دے۔ اس نے تکیے پر سر رکھ کر سوچا۔ ''مجھے دراصل اتنی شدت سے احساس ہو رہا ہے، اس لئے کہ یہ میری زندگی کا پہلا اخلاقی جرم ہے۔'' اس نے اندر کی کش مکش سے نڈھال ہو کر آنکھیں موند لیں۔ ''اے خدا.....! اس سے یہاں کا پتا کھو جائے یا اس کا باپ اسے شہر ہی نہ آنے دے۔'' اس نے معصوم سی دُعائیں کیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

روایتی انداز میں شادی ہوئی اور وہ بیاہ کر خالہ کے گھر چلی گئی۔ عارف نے اس کے پاؤں تلے دل بچھا کر اس کا سواگت کیا۔

اتنا شاندار اور چاہنے والا شوہر جس کی مہکتی قربت نے اسے کھلکھلاتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر ہنستی کھیلتی لڑکی بن گئی۔ پہلے جیسی ویل ڈریسڈ، جانِ محفل قسم کی۔ عارف کو دیکھ دیکھ کر جینے والی۔ عارف اس کے خالہ زاد تھے۔ انہوں نے آپس میں شادی سے پہلے بہت باتیں کی تھیں مگر نیلوفر نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ عارف نے سوچا ہو تو سوچا ہو جس طرح اپنے ڈھیروں کزنز سے ملتی تھی، اسی طرح عارف سے بھی ملتی تھی۔ وہ سوچتی، عارف بھی تو چاہے جانے کے قابل ہیں، کیا کمی ہیں ان میں۔

ایک شام وہ شاپنگ کرنے نزدیکی شاپنگ سینٹر گئے۔ گرمیاں آ گئی تھیں، لان کے بہت خوبصورت پرنٹ آ گئے تھے یوں بھی شادی کے بعد اس نے سوتی کپڑے نہیں بنائے تھے۔ وہ پرنٹ کے انتخاب میں مصروف تھی۔ عارف خالو جان کی دوائیاں لینے چلے گئے۔ نزدیک ہی میڈیکل اسٹور تھا۔ عارف کے اندازے کے برعکس وہ جلد ہی نمٹ گئی۔ شاپنگ بیگ سنبھال کر وہ نئی کاسمیٹکس دیکھنے سامنے بڑھی ہی تھی کہ کوئی اس کے راستے میں آ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم.....!''

اس نے گڑبڑا کر دیکھا۔ مانوس آواز، مانوس چہرہ، اسے کائنات گھومتی محسوس ہونے لگی۔ سفید براق شلوار قمیص میں نفیس ہیئر اسٹائل کے ساتھ شاہ نواز کھڑا تھا۔ ہاتھ میں سیاہ فائل، جیب میں اٹکا سنہرا قلم۔

''تت.....تم.....؟''

''پہچانی نہیں آپ.....! میں نے آپ سے کیا کہا تھا کہ کل کو میں کچھ بن جاؤں اور آپ پہچاننے سے ہی انکار کر دیں! کہا تھا نا.....؟ جب آپ کو میں ہی یاد نہیں تو میری بات کیا یاد ہوگی.....؟'' اس کے لہجے میں پہلے جیسی عاجزی نہیں تھی۔ عجیب سی شگفتگی اور خود اعتمادی تھی۔

''آپ کا گھر تو میں نے ڈھونڈ نکالا تھا پھر سوچا، اس طرح جاتا کیا اچھا لگتا ہوں۔ پہلے کچھ بن تو جاؤں۔''

''پڑھ رہے ہو شاہ نواز.....؟'' اس کی فائل پر نظر دوڑا کر نیلو نے آہستگی سے پوچھا۔

''جی.....! آپ کے حکم کے مطابق۔ داخلہ تو حیدرآباد کے کسی کالج میں بھی لے سکتا تھا مگر کراچی میں پڑھنا اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''چلو خیر یہ تو تم نے اچھا کیا۔'' وہ تھوک نگل کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

شاہ نواز کو وہ پہلے سے زیادہ نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ سبز ریشمی لباس، اُنگلیوں میں اُنگوٹھیاں، کانوں میں چھوٹی چھوٹی جھمکیاں، گلے میں نازک سا لاکٹ۔ نئی نئی دُلہن کے سارے انداز تھے اور نیلو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوش فہم اور بے وقوفی کی حد تک سادہ اس شخص کو کس طرح ٹالے۔ اسی دم عارف آ گئے۔

''ارے.....! تم فارغ بھی ہو گئیں۔ مجھے دیر تو نہیں ہوئی، پریشان تو نہیں ہوئیں تم .....؟'' وہ بولتے بولتے یک دم رُک گئے۔ انہوں نے شاہ نواز کو دیکھنے کے بعد نیلو کی طرف دیکھا۔

''میں نے بتایا تھا ناں آپ کو کہ ایک مرتبہ میں ماموں جان کے ساتھ نوکوٹ گئی تھی۔ حسنہ، عابدہ بخاری، علی رضا وغیرہ بہت سے لوگ تھے۔ ہماری ان سے ملاقات نوکوٹ میں ہوئی تھی۔ انہوں نے ہماری بہت مدد کی تھی۔ غالباً شاہ نواز نام ہے ان کا۔ پڑھنے آئے ہیں یہ کراچی، ابھی یہی بتا رہے تھے۔''

''اوہ، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' عارف نے فطری خوش دلی سے ہاتھ ملایا۔ مجھے عارف قریشی کہتے ہیں۔ آپ کراچی میں ہیں تو ہمارے ہاں بھی کبھی آیئے۔ کیوں بیگم صاحبہ، آپ دعوت نہیں دیں گی.....؟'' عارف نے رسماً کہا تھا۔

''آپ نے کہہ دیا، ایک ہی بات ہے۔'' وہ تصنع سے ہنستے ہوئے بولی۔

''یہ..... یہ.....'' شاہ نواز نے اُنگلی اُٹھا کر پوچھنے کی کوشش کی۔

''میرے شوہر ہیں، اچھا بھئی خدا حافظ.....'' وہ آگے بڑھ گئی۔

عارف نے ہاتھ ملایا اور وہ اس پتھریلی، دوغلی لڑکی کو تکتا رہ گیا۔

وقت کی کوکھ سے نئے موسم، نئے دُکھ تخلیق ہونے لگے۔ دُکھ بھی وہ جن کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عارف دو ماہ کے لئے نیروبی گئے تھے۔ ایک رات برانچ آفس سے ہوٹل جاتے ہوئے کسی حبشی لٹیرے کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ نیلو دو ماہ کے بیٹے کو سینے سے لگائے سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی۔ اس کے ہاتھوں سے خوبصورت چوڑیاں اُتار دی گئیں اور سفید براق لباس میں وہ چلتی پھرتی لاش بن کر زندگی گزارنے لگی مگر زندگی گزارنا آسان تو نہ تھا۔ بیوگی کا پہاڑ،

تنہائی کا عفریت، بیٹے کا ساتھ اور لوگوں کی روایتی گردان..... ''نازک زمانہ۔''
کیا مل گیا قدرت کو اس خوش کن لمحاتی کھیل سے.....؟''

خود ہی سب کچھ دیا مولا.....! خود ہی لے بھی لیا۔

وہ وقت سے پہلے ہار گئی۔ مقدر سے ہار گئی۔ شکست کا خوبصورت بہلاوا اس کی گود میں ہمک رہا تھا۔ اب وہ لاابالی لڑکی نہیں تھی جو پتھر کے زمانے میں آسانی سے پہنچ گئی تھی۔ اب وہ ذمہ دار ماں تھی۔ اس نے بیٹے کو دیکھا اور مقصد حیات متعین کر لیا۔

لمحے سرکتے سرکتے سالوں میں ڈھلنے لگے۔

دُنیا نے کہا، ''تو حسین ہے، تیرے بہت طلبگار ہیں، شادی تحفظ دے گی، سہارا ملے گا۔''
مگر وہ بہری بن گئی۔ اپنے لئے ہر اچھی خبر کو حرام کر لیا۔ سلگ سلگ کر اندر سے کندن بننے لگی۔
ہر رشتہ اس کے جی کو آزار پہنچانے لگا۔ وہ محض حوا بن کر جینے لگی۔ حوا، جس کی ماں نہیں تھی، باپ نہیں تھا، ساس سسر نہیں تھے، بہن بھائی نہیں تھے۔ وہ بس حوا تھی، ایک ماں تھی۔ ایک مرد اس نے بے وفائی کی۔ ایک مرتبہ کوئی اس سے کر گیا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ اردگرد سے بے نیاز ہو کر بس اپنے بیٹے میں مگن ہو گئی۔ ناز اُٹھانے والی، گھٹنے ٹیکنے والی رحم دل ماں۔

آج اس سے اس کے عزیز از جان بیٹے نے سیر کے لئے چلنے کو کہا تھا۔ سمندر کی سیر اسے بہت خوشی دیتی تھی۔ وہ کلفٹن چلی آئی۔ اس کے بیٹے نے، جس کا نام اس نے بڑی چاہ سے مراد رکھا تھا، فرمائش کی کہ وہ اونٹ پر بیٹھے گا۔ وہ شتربان کے پاس چلی آئی۔ اسی دم دو تین بچے اونٹ پر سوار ہو گئے تو وہ مراد کا ہاتھ تھام کر رُک گئی۔

''میم صیب.....! ابا (بیٹے) کو ڈاچی پر بٹھا دوں.....؟'' شتربان نے پوچھا۔

''ارے نہیں بھئی، تمہاری ڈاچی پر تو پہلے ہی اتنے بچے سوار ہیں۔ کہیں گر نہ جائے۔'' وہ ناک پر سن گلاسز ٹھیک کرتی ہوئی دوسرے شتربان کے پاس چلی آئی۔

''امی.....! اونت والا اونت کو ڈاچی کیوں کہہ رہا تھا.....؟'' مراد اُلجھا۔

''بیٹے، سندھی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ڈاچی، اونٹنی کو بولتے ہیں بیٹا۔ آؤ دیکھو وہ اونٹ خالی بیٹھا ہوا ہے۔ اس پر بٹھائیں آپ کو۔ ڈریں گے تو نہیں آپ.....؟''

''امی آپ بھی بیٹھیں ناں.....!''

''نہیں بیٹا مجھے ڈر لگتا ہے اونٹ سے.....آپ تو بہادر ہیں ناں۔'' اس نے ہنس کر بہانہ بنایا۔ ''سنو اونٹ والے.....! ذرا اس بچے کو سیر کرا دو۔ زیادہ دُور نہ لے جانا، بس یہیں ساحل پر، آو بیٹا۔'' مراد اُچک کر اونٹ پر بیٹھنے لگا۔

اونٹ والا کھڑا ہو گیا۔ اس نے منہ پر سے مفلر ہٹا دیا، وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ ''شاہنواز.....!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''تت.....تم.....؟ ارے یہاں.....؟'' وہ بول نہ پائی ٹھیک سے۔

''جی.....! بیٹھو بیٹا، اے شاباش۔'' وہ بے پروائی سے اپنے کام میں مگن تھا۔

وہ ساکت سی کھڑی تھی۔ اسے یہ سب دیکھ کر دلی صدمہ ہوا تھا۔ احساسِ جرم صحرا کے پرندے کی طرح اس کے دل پر پھڑ پھڑانے لگا۔ ''وہ.....تم تو پڑھ رہے تھے شاہنواز.....؟'' وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

''پڑھ لیا میم صیب.....!'' وہ بے اعتنائی سے جواب دے کر اونٹ کو اُٹھانے لگا۔

''پھر تم پڑھ لکھ کر یہ کام کیوں کر رہے ہو.....؟'' اس نے ساحل کی ریت میں لھتڑے شاہ نواز کے ننگے پیروں پر نظریں جما کر پوچھا۔

''میں کام کرنے کے لئے نہیں پڑھ رہا تھا۔ ٹک.....ٹک.....ٹک۔'' وہ اونٹ ہنکانے لگا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا شاہ نواز.....؟'' اس کا دل رو پڑا۔

''میم صیب.....! اس وقت آپ میم صیب ہیں اگر صحرا والی بی بی ہوتیں تو میں آپ سے بہت کچھ پوچھتا میم صیب.....! ایسے نہیں کرتے۔'' وہ مہار تھام کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنی جگہ پر نادم کھڑی تھی۔ وہ سادہ سا نوجوان جو اپنی ذات سے بے نیاز تھا، جسے ایک شہری لڑکی نے ذات کی پہچان دی تھی، اس حال کو بھی پہنچ سکتا ہے، نیلوفر کے تصور میں بھی نہیں تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ مراد کو لے کر واپس آ گیا اور آہستگی سے بچے کو اُتارا۔

''امی.....! اونٹ والے کو پیسے دیجئے۔'' ماں کو گم دیکھ کر اس نے ماں کا ہاتھ ہلایا۔

اس کی ہمت نہیں پڑی کہ پرس کھول کر پیسے نکال کر دے۔ وہ خزانہ بھی دے دیتی تو نادان پورا نہ ہوتا۔ وہ ایک قیمتی نوجوان تھا۔ جو اس کی حماقت، اپنی سادگی اور کم علمی کی بنا پر

خاک ہو رہا تھا۔

کم علم ہی تو تھا۔ صحرا اور ساحل تک محدود۔ آنکھیں کھول کر دُنیا دیکھتا تو خاک نہ ہوتا کہ اس دُنیا میں تو روز توقعات توڑی جاتی ہیں، منہ پھیرے جاتے ہیں۔ وہ خواب جو صحرا میں تخلیق ہوا تھا، وہ اب تک اس کے اثر سے باہر نہیں تھا۔ اتنی خوبصورت مہربان شہری لڑکی۔ اسے تو راتوں کو نیند بھی نہیں آتی تھی۔ وہ اسے کراچی کا پتا بتا کر گئی تھی۔ اسے تو یوں محسوس ہوتا تھا گویا کراچی شہر کی اعزازی کنجی دے گئی ہو۔ ہر وقت اس کے اعصاب پر کراچی سوار رہنے لگا تھا۔

سوچتے سوچتے شاہ نواز نے سر اُٹھایا اور مراد کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''میم صیب.....! آپ کا بچہ بہت پیارا ہے۔'' لمحاتی توقف کے بعد پھر گویا ہوا۔ ''اللہ دعا بازوں کو کتنا نوازتا ہے۔ عجیب قدرت ہے اس کی۔'' پہلی بار اس کے لہجے میں تلخی جھلکی اور وہ مہار تھام کر آگے بڑھتا چلا گیا۔

''شاہ نواز سو مرو، وہ تمہاری بھی سنتا ہے۔ بہت بڑی قیمت چکائی ہے میں نے۔ شاہ، اب مجھے مزید بددُعا نہ دینا۔ تیری سادگی کی قسم.....! کاسۂ حیات میں سکون کا کھوٹا سکہ بھی نہیں۔ کوئی جھوٹا بہلاوا بھی نہیں۔ میں خود مختار ہوں مگر پتھروں کے زمانے میں نہیں جا سکتی۔ زمانہ نہیں بدل سکتی کہ آج مجھ میں اور صحرا کی نیلو میں بہت فرق ہے۔ اس وقت وہ اتنی کمزور تھی کہ نفس کی اشتہا سے بے بس ہو گئی تھی۔ پتھروں کے زمانے کی لاعلم عورت بن جانے کو تیار تھی مگر آج میں وہ وحشی عورت نہیں بن سکتی جس نے دل ہتھیلی پر سجا رکھا تھا۔ ہر جذبے سے عاری رہنے پر مجبور ہوں۔ میں ایک متمدن مشینی عورت ہوں۔ مجھے متمدن بن کر جینا ہے کہ یہ بچہ میرے تمدن کا سمبل ہے۔ میں خود مختار ہوں، آزاد ہوں مگر جب بچے کی سمت دیکھتی ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔'' دور شاہ نواز سر جھکائے جا رہا تھا۔ نیلو مراد کی اُنگلی تھامے گھر پلٹ گئی اور دل میں دُعا مانگنے لگی۔ ''اے خدا.....! مجھے شاہ نواز کا خون معاف ہو۔ اے خدا.....! مجھے ایک انسان کا خون معاف ہو.....اے خدا.....!''

⌘ ⌘ ⌘